بٹّا

محمد طارق

''انعامدار ہاؤس'' کھولا پور، ضلع امراوتی۔444802، مہاراشٹر، موبائل:8055503366

وہ اسپتال کے "PICU" (Pediatric Intensive Care Unit) کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ دروازہ کانچ کا تھا۔ کانچ پر گلاب کے پھول اور پھولوں کے درمیان دو ننھّے بچوں کے مسکراتے ہوئے چہرے بنے ہوئے تھے۔ پھول کی طرح کھلے کھلے چہرے.... چہروں کے ٹھیک اوپر کانچ کا گول حصّہ شفاف تھا جس میں سے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔

وہ شفاف کانچ سے اندر جھانک رہا تھا۔ اندر اُس کا بیٹا تھا جسے دنیا میں آئے ابھی صرف آٹھ روز ہی ہوئے تھے۔

آٹھ روز پہلے جب اُس کی بیوی کو دردِ زہ شروع ہوا تھا تب وہ فوراً اُسے اسپتال لے گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اُس کی بیوی کو ایڈمٹ کرنے میں کوتاہی نہیں کی تھی کیوں کہ وہ اُس کی پیشنٹ تھی۔ جب اُسے دو ماہ کا حمل تھا تب سے وہ اپنی بیوی کو اُس لیڈی ڈاکٹر کے پاس بلاناغہ ہر ماہ چیک اپ کے لیے لاتا رہا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کی اُس نے کافی تعریف سنی تھی۔

ابھی اُس کی بیوی کو اسپتال میں ایڈمٹ ہوئے تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ لیڈی ڈاکٹر اُس کے پاس آئی۔

''تمھاری پتنی کو زیادہ درد نہیں آرہا ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا، تیس ہزار روپے خرچ آئے گا۔ دوائیں الگ!''

یہ سنتے ہی اُس کے پیروں تلے کی زمین کھسکنے لگی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں لیڈی ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ڈاکٹرنی صاحبہ! میں غریب آدمی ہوں!''

''غریب ہے تو سرکاری اسپتال لے جانا تھا!'' لیڈی ڈاکٹر کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

''آپ کی میں نے بہت تعریف سنی اس لیے جیسے ہی میری بیوی کے حاملہ ہونے کا مجھے پتہ چلا، آپ کے پاس ہی لاتا رہا ہوں!''

''ارے بھیّا! تمھاری بات برابر ہے، مگر یہ سرکاری اسپتال نہیں ہے۔ پتنی کی زندگی چاہیے تو آپریشن کرانا ہوگا۔ کیوں کہ اُسے درد نہیں آرہا ہے!''

لیڈی ڈاکٹر نے اُسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ! اُسے درد آرہا ہوگا، مگر اُسے درد سہنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ زمانے سے وہ درد سہتی آرہی ہے۔ بیٹی ہونے کا درد، بہن بننے کا درد، سماج میں بے حیثیت ہونے کا درد اور اب ماں بننے کا درد—، وہ درد کا کبھی اظہار نہیں کرتی۔ بہت سہن شکتی ہے اُس میں۔ اُسے درد ہو رہا ہوگا، آپ یقین کیجیے، آپ بھی ایک عورت ہیں، دیکھنا، بغیر آپریشن کے ہی اُسے بچّہ ہوگا۔ آپ تھوڑا انتظار تو کیجیے!''

''میں انتظار نہیں کرسکتی، اندر بچّہ کمزور ہے۔ بچے کی جان جاسکتی ہے یا ماں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا'' لیڈی ڈاکٹر نے پھر اُسے ڈرایا۔

''نہیں ڈاکٹرنی صاحبہ! تھوڑا انتظار کر لیجیے، میں جانتا ہوں میری بیوی کیسی ہے۔ درد سہنے کی بہت شکتی ہے اُس میں جب جب اُسے بخار آیا۔ ہاتھ، پاؤں، کمر میں درد ہوا۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ گھر کا سارا کام کاج خموش کرتی رہی....''

''کیسے آدمی ہو تم! میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا بک بک کیے جارہے ہو!'' لیڈی ڈاکٹر نے اُسے ڈانٹا۔

اُسی وقت ایک نرس دوڑی دوڑی آئی۔

''میڈم—! اِن کی پتنی کی ڈلیوری ہوگئی!'' نرس اُس کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

جواب میں لیڈی ڈاکٹر نے تیوری چڑھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

نرس سے خبر سن کر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔

''میڈیم!'' (نرس کی زبان سے میڈم سُن کر وہ ڈاکٹرنی کو میڈم کہنے لگا۔)

''میڈم—! میں نے کہا تھا نا میری پتنی کو درد سہنے کی عادت ہے۔ اُس نے ماں بننے کے درد کو بھی ظاہر نہیں کیا۔ کیا ہوا اُسے، لڑکا یا لڑکی؟!'' وہ نرس سے پوچھنے لگا۔

نرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر کے ماتھے کی شکنوں کے شکنجے میں پھنس گئی تھی اور مجرم کی طرح سر جھکا کر جا چکی تھی۔

وہ لیڈی ڈاکٹر سے مخاطب ہوا ''میری پتنی کو لڑکا ہوا یا لڑکی؟ یہ بتا دیجیے نا!''

جواب میں لیڈی ڈاکٹر نے سر ہلا کر ''ہوں'' کہا اور چلی گئی۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ واپس آئی اور کہا: ''بھگوان کی کرپا سے تمھاری پتنی کی ڈلیوری تو نارمل ہوگئی۔ لڑکا ہوا ہے، مگر بچہ بہت کمزور ہے۔ پیدا ہونے کے بعد وہ رویا نہیں!''

''تو کیا ہوا—، زندگی بھر تو اُسے میری طرح رونا ہی ہے نا!''

''وہ رونا الگ ہے اور بچہ کا پیدا ہوتے ہی نہ رونا خطرے کی بات ہے!''

لیڈی ڈاکٹر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''عجیب بات ہے میڈم! انسان کا پیدا ہوتے ہی نہ رونا خطرے کی بات بن جاتی ہے اور اُس کا زندگی بھر کا رونا کسی کے لیے خطرے کی بات نہیں بنتی!''

''تمھاری اس طرح کی بکواس سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر چڑ کر کہنے لگی۔ ''بچہ بہت کمزور ہے اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُسے فوراً 'PICU' میں ایڈمٹ کرنا ہوگا۔ میرے اسپتال میں 'PICU' نہیں ہے، جلدی بتاؤ—!'' لیڈی ڈاکٹر نے اُسے اس انداز میں کہا کہ وہ گھبرا گیا۔

''کس اسپتال میں PICU ہے۔ میرے بیٹے کو کہاں ایڈمٹ کرنا ہوگا؟'' اُس کے لہجے میں لرزش آ گئی تھی۔

''ٹھہرو—، میں بات کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کیبن میں چلی گئی۔

وہ خوفزدہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ سر جھکائے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھے۔

کیبن میں لیڈی ڈاکٹر کے کان سے موبائل فون لگا تھا۔

وہ "PICU" والے اسپتال کے ڈاکٹر سے مخاطب تھی۔

''PICU کا کیس بھیج رہی ہوں۔ ڈلیوری نارمل ہوئی ہے۔ بچہ بھی تندرست ہے مگر اُسے آٹھ دس روز روکے رکھنا!''

''پارٹی کیسی ہے؟'' اُدھر سے ڈاکٹر نے پوچھا۔

''پارٹی تو خود کو غریب کہہ رہی ہے۔ ہر کوئی میرے پاس آتا ہے تو پہلے خود کو غریب ہی بتاتا ہے۔ جیسے دیش کے سارے غریبوں کے لیے ہی میں نے اسپتال کھولا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

''پھر بھی کتنا دم ہے!'' ڈاکٹر نے منجھے ہوئے بیوپاری کے انداز میں پوچھا۔

''انگلی ٹیڑھی کرنے پر خود ہی پتہ لگ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے بھیج دو! ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا مجھے آتا ہے۔''

''میرا کمیشن دینا مت بھولنا۔ میں نارمل ڈلیوری کے زیادہ پیسے نہیں لیتی۔''

''ٹھیک ہے نا—!'' ڈاکٹر نے اطمینان دلایا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر موبائل فون کان سے ہٹا لیا اور پھر فاتحانہ انداز میں اپنے کیبن سے نکل کر باہر آئی۔

اُسے دیکھ کر وہ فوراً بینچ سے اُٹھا۔ لیڈی ڈاکٹر اُس کے پاس آئی اور اُس سے کہا ''میں نے PICU اسپتال کے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ بہت مشکل سے ڈاکٹر صاحب راضی ہوئے ہیں۔

''اسپتال کا نام؟'' بے تابی سے اُس نے پوچھا۔

لیڈی ڈاکٹر نے اسپتال کا نام و پتہ بتایا۔ پتہ سُن کر وہ بڑی عجلت میں اسپتال کے گیٹ سے نکلا۔ اپنے بیٹے کو ایڈمٹ کرنے کے لیے اُس نے آٹو رکشہ ٹھہرایا۔ اسپتال میں گیا۔

جب نرس نے لحاف میں لپٹا اُس کا نوزائیدہ بیٹا اُسے سونپا تو اُس کی بانہوں میں بیٹا رونے لگا۔ وہ خوشی سے تقریباً چیخ اُٹھا۔ میڈم! دیکھو، میرا بیٹا رو رہا ہے— میرا بیٹا رو رہا ہے!

اُس کی آواز سُن کر میڈم اپنے کیبن سے نکل آئی اور اُس کی مسرت کو یہ کہہ کر خوف میں بدل دیا کہ ''بچے کے دل کی دھڑکن برابر نہیں چل رہی ہے۔ اُسے ہارٹ کا پرابلم ہے۔ دیر مت کرو، جاؤ، جلدی، فوراً۔''

وہ خوفزدہ۔ گھبرایا۔ گھبرایا اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے آٹو رکشہ میں بیٹھ گیا۔

''بھائی! جلدی چلو، میرے بیٹے کو ہارٹ کا پرابلم ہے!'' لرزتے لہجے میں وہ آٹو رکشے والے سے بولا۔

''دوسرے ہی پل آٹو رکشہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ اسپتال پہنچ گیا۔

اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے آٹو رکشے سے اُتر کر اسپتال کی سیڑھیاں چڑھا۔ ویٹنگ روم میں پہنچا جہاں کرسی پر نرس بیٹھی آنے والے مریضوں کے کارڈ بنا رہی تھی۔ وہ سیدھا اس نرس کے پاس گیا۔

''میڈم! مجھے فلاں اسپتال سے بھیجا گیا ہے۔ میرا بیٹا سیریس ہے!''

نرس فوراً ڈاکٹر کے کیبن میں گئی۔ دوسرے ہی پل واپس آ کر اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بچہ لے کر کیبن میں پہنچا۔ ڈاکٹر اسٹیتھوسکوپ 'Stethoscope' سے بچے کی جانچ کرنے کے بعد اُس سے مخاطب ہوا۔

''بچے کے دل کی دھڑکن برابر نہیں ہے اسے ہارٹ کا پرابلم ہے۔ PICU میں رکھنا ہوگا۔''

''جی صاحب! اوپر بھگوان نیچے آپ، میرے بیٹے کو بچا لیجیے!'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''ہوں!'' ڈاکٹر نے سر ہلایا ''ٹھیک ہے، کاؤنٹر پر دس ہزار روپے جمع کرادو۔''

''دس ہزار روپے!'' اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال تن گیا۔

''ہاں—، دس ہزار روپے!'' ڈاکٹر بھویں سکیڑ کر بولا۔

''میرے پاس ابھی اتنے پیسے نہیں ہیں!''

''پیسے نہیں ہیں تو بچہ لے جاؤ—، یہاں علاج کے لیے پیسے لگتے ہیں!''

ڈاکٹر کے پاس تھوڑی بھی ہمدردی نہیں تھی۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہاتھ جوڑ کر کپکپاتی آواز میں ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب! میرے پاس صرف پانچ ہزار روپے ہیں۔ مجھے آج کے دن کی مہلت دیجیے۔ میں کل پانچ ہزار روپے اور جمع کرادوں گا۔

''ٹھیک ہے!''

ڈاکٹر نے ٹیبل پر رکھی بیل بجائی— نرس آئی۔

ڈاکٹر نرس سے مخاطب ہوا ''ان کے بچے کا کارڈ بناؤ اور بچے کو PICU میں لے جاؤ۔''

وہ ڈاکٹر کو تشکّر آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا.....

''ڈاکٹر بولا'' تم آج پانچ ہزار روپے اور کل پانچ ہزار روپے جمع کرادیتا۔ PICU کا چارج پانچ ہزار روپے روز ہے سمجھے!'' وہ لاچار انسان کی طرح سر ہلا کر رہ گیا۔

نرس نے ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کی۔ کارڈ بنا کر اُسے تھمایا پھر اُس کے بیٹے کو لے کر کیبن سے نکلی۔ وہ بھی اُس کے پیچھے ہی چلا....نرس PICU کا دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر گئی وہ بھی اُس کے ساتھ ہی گھسا۔ نرس نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ''اے! اندر نہیں آنا۔ یہ PICU ہے یہاں صرف بچے کی ماں آسکتی ہے۔ تم باہر ہی کھڑے رہو۔ دیکھنا ہے تو کانچ سے اندر دیکھو!''

''ٹھیک ہے!'' وہ دروازے کے باہر کھڑا شفاف گول کانچ سے اندر جھانکنے لگا۔

نرس نے اُس کے بیٹے کو سفید چادر والے بستر پر لٹا دیا اور باہر آئی۔ اُسے دروازے کے باہر کھڑا دیکھ کر تلخ لہجے میں بولی۔ ''تم ابھی تک یہاں کھڑے ہو، کاؤنٹر پر جا کر اپنا نام، پتہ، کس اسپتال میں پتنی کی ڈلیوری ہوئی یہ سب لکھا کر پیسے جمع کردو۔ یہاں کا قاعدہ ہے پیسے جمع کرنے سے پہلے بچے کو PICU میں نہیں رکھا جاتا۔''

اُس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ مجرم کی طرح سر جھکا کر کاؤنٹر پر گیا۔ اپنا نام، پتہ، جس اسپتال میں پتنی کی ڈلیوری ہوئی۔ اُس کا نام لیڈی ڈاکٹر کا نام لکھا کر پانچ ہزار روپے جمع کرائے اور باقی پانچ ہزار روپے کل جمع کرنے کا وعدہ کر کے اسپتال سے نکل آیا۔

بیٹے کی پیدائش کی خوشی کو بیٹے کی زندگی کے لیے پیسے جمع کرنے کی فکر کھا گئی تھی۔ وہ پریشان اپنے دوستوں کے پاس گیا۔ اُس کے دوست مالدار نہیں تھے۔ کیوں کہ غریب کے دوست مالدار نہیں ہوتے۔ دوستوں سے اُس نے دس ہزار روپے قرض لیا اور اپنا چار ایکڑ کھیت چالیس ہزار روپے میں مہاجن کے پاس ایک سال کے لیے گروی رکھ دیا۔

پچاس ہزار روپے جیب میں آتے ہی اُس پر چھائی لاچاری۔ بے بسی اور مایوسی ختم ہوگئی۔

پیسہ جذبات واحساسات کو بھی کیسا کنٹرول کر لیتا ہے۔ جیسے پیسہ انسان کے لیے ایک ٹانک— ایک پاور خدا کی بنائی ہوئی دنیا کا حاکم—! شاید اس لیے کہ دنیا بازار بن چکی ہے۔ ہر رشتہ ہر جذبہ خرید وفروخت کی چیز— ہر کام تجارت!

وہ بازار بنی دنیا میں پچاس ہزار روپے جیب میں رکھ کر اب سر اُٹھائے ایک باحیثیت شخص کی طرح اس اسپتال میں پہنچا جہاں اُس کی بیوی ایڈمٹ تھی۔ اسپتال پہنچ کر وہ لیڈی ڈاکٹر سے ملا۔

''میڈم! ڈاکٹر صاحب نے میرے بیٹے کو ایڈمٹ کرلیا ہے، مگر PICU میں ماں کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے....''

''ہاں، میں سمجھ گئی تو کیا کہنا چاہ رہے ہو'' لیڈی ڈاکٹر اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

''تمھاری پتنی ابھی کمزور ہے۔ آج ہی اُس کی ڈلیوری ہوئی ہے میں اُسے پرسوں چھٹی دے دوں گی۔''

''ٹھیک ہے!'' اُس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنی بیوی سے ملا اُسے بچے کے بارے میں بتایا....

بیوی رونے لگی۔ اُس نے بیوی کو دلاسہ دیا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ اپنی بیٹا اچھا ہے۔ تھوڑا کمزور تھا اس لیے ڈاکٹرنی نے PICU میں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ پرسوں تمھاری چھٹی ہوجائے گی تم خود چل کر دیکھ لینا!''

''سچ کہہ رہے ہونا!'' بیوی کی پلکوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹنے لگے....

''بھگوان کی قسم!''

بیوی اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر بولی ''بھگوان کے بعد میں تم پر ہی بھروسہ کرتی ہوں!''

اُس نے خاموش بیوی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے اطمینان دلایا اور پھر اسپتال سے نکل کر اس اسپتال میں پہنچا جہاں اُس کا بیٹا ایڈمٹ تھا۔

دو روز تک وہ دونوں اسپتالوں کے چکّر لگاتا رہا....تیسرے دن اُس کی بیوی کو چھٹی ملی۔ چھٹی دینے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر اُس سے نارمل ڈلیوری کے سترہ ہزار روپے وصول کرنا چاہ رہی تھی۔ اُس نے بہت منت سماجت کی تو پندرہ ہزار روپے لینے پر راضی ہوئی تھی۔

پندرہ ہزار روپے ادا کر کے وہ اپنی بیوی کو اس اسپتال میں لے آیا تھا جہاں اُس کا بیٹا ایڈمٹ تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی اُس کی بیوی نرس کے ہمراہ PICU میں گئی۔ وہ کانچ کے گیٹ سے اندر جھانکنے لگا تب ہی ایک نرس اُس کے پاس آئی۔

''اے بھیّا! وہاں بینچ پر بیٹھو، رش مت کرو!''

''رش کہاں ہے، میں تو اکیلا ہی ہوں!'' وہ بولا۔

''تم اکیلے ہو تو اور بھی لوگ آ کر کھڑے ہوں گے، تمھاری پتنی اندر گئی نا، اب تم وہاں بینچ پر بیٹھ جاؤ!'' نرس کے لہجے میں ترشی تھی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ خون کا گھونٹ پی کر خموش بینچ پر بیٹھ گیا۔

اُس کی نظریں PICU کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا نرس کے ہمراہ اُس کی بیوی باہر آئی۔ بیوی کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ بیوی کا پُرمسرت چہرہ دیکھ کر وہ نرس کے لہجے کی کڑواہٹ بھول گیا۔ بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بیوی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ''اپنا بچہ تو بہت اچھا ہے جی! مجھ سے چمٹ کر ایسا دودھ پیا جیسے بہت بھوکا ہو۔ چلو، ڈاکٹر سے کہہ کر چھٹی لے لیں گے!''

''چلو—!''

وہ دونوں ڈاکٹر کے کیبن میں گئے۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ میری پتنی، ابھی PICU میں گئی تھی۔ اس نے بچے کو دیکھا۔ بچہ اچھا ہے۔ اُسے چھٹی دے دیجیے نا!''

''چھٹی!'' ڈاکٹر کے تیور بدل گئے۔ ''میں ابھی چھٹی نہیں دے سکتا۔ بچہ اچھا اس لیے لگ رہا ہے کہ اُس کا علاج جاری ہے۔ جانتے ہو اُسے ہارٹ کا پرابلم ہے، اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''ہارٹ کا پرابلم کب دور ہوگا؟'' اُس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''کہہ نہیں سکتا، چار، پانچ روز لگ سکتے ہیں!''

اُس نے حساب لگایا۔ چار پانچ روز یعنی تین روز ملا کر آٹھ روز—، آٹھ روز یعنی پانچ ہزار روپے روز کے حساب سے آٹھ پنجے چالیس ہزار روپے—دس ہزار روپے میں اسپتال کے کاؤنٹر پر جمع کرا چکا ہوں اور اب میری جیب میں تیس ہزار روپے ہیں۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!'' ذہن میں حساب لگانے کے بعد اُس نے ڈاکٹر سے کہا اور اپنی بیوی کو لے کر کیبن سے نکل آیا۔

آج اُس کے بیٹے کو PICU میں رکھے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی پھر ڈاکٹر کے کیبن میں گئے۔

وہ ڈاکٹر سے بڑی نرمتا سے مخاطب ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحب! ہمارے بیٹے کو PICU میں رکھے آٹھ روز ہو چکے ہیں۔ روز میری پتنی دن میں تین بار اُسے دیکھ رہی ہے۔ دودھ پلا رہی ہے۔ وہ اچھا ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلا رہا ہے۔ قلقاریاں مار رہا ہے۔ اُسے چھٹی دے دیجیے۔ ہمارے پاس بچے کو PICU میں اور زیادہ دن رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔''

ڈاکٹر اپنے ذہن میں آمدنی، خرچ اور کمیشن کا حساب لگا کر بولا: ''ٹھیک ہے، چالیس ہزار روپے کاؤنٹر پر جمع کر دو اور بچے کو لے جاؤ۔ آٹھ روز بعد چیک اپ کے لیے لے آنا!؟''

''چالیس ہزار روپے!'' اُس نے متحیرانہ لہجے میں ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

''ہاں—، چالیس ہزار روپے!'' ڈاکٹر سر ہلا کر بولا۔

''مگر میں نے پانچ پانچ ہزار کر کے دس ہزار روپے جمع کر دیا تھا۔ PICU کا چارج پانچ ہزار روپے روز کے حساب سے آٹھ روز کا چالیس ہزار روپے ہوتا ہے۔ میں تیس ہزار روپے لایا ہوں!''

''تم نے جو دس ہزار روپے جمع کرائے تھے اس میں پانچ ہزار روپے میڈیکل خرچ اور پانچ ہزار روپے ڈاکٹر کی چیک اپ فیس!'' ڈاکٹر نے حساب بتایا۔

''ڈاکٹر صاحب! ہمارے پاس چالیس ہزار روپے نہیں ہیں، کچھ کم کر دیجیے نا!'' اُس کی بیوی گڑگڑائی۔

''ارے بھئی! یہ زیادہ نہیں ہے، میں بہت کم چارج لے رہا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب! کچھ کم کر دیجیے، بڑی مہربانی ہوگی!'' وہ ہاتھ جوڑ کر خوشامد کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے، میں اپنے چیک اپ کی فیس دو ہزار روپے کم کر دیتا ہوں!''

ڈاکٹر نے ہمدردی کا ناٹک کرتے ہوئے فراخ دلی دکھائی۔ ''تم اڑتیس ہزار روپے جمع کرا دو!''

''میرے پاس صرف تیس ہزار روپے ہیں۔ میں اپنا کھیت گروی رکھ کر لایا ہوں۔ اب میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ صرف میری پتنی کے کانوں میں یہ سونے کی بالیاں ہیں!'' وہ بیوی کے کانوں میں لٹکی بالیوں کی طرف اشارہ کر کے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں—، ڈاکٹر صاحب! تیس ہزار روپے اور یہ میری بالیاں لے کر بچہ ہمارے حوالے کر دو!'' بے تابی سے اُس کی بیوی بولی۔

ڈاکٹر چڑ گیا۔ ''یہ مہاجن کی دکان نہیں ہے۔ اسپتال ہے سمجھے! یہاں کیش چلتا ہے کیش، جاؤ بالیاں بیچ کر پیسے لے آؤ، اڑتیس ہزار سے ایک پیسہ بھی کم نہیں لگے گا!''

ماں کی ممتا تڑپ اُٹھی ''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب—، ٹھیک ہے!'' پھر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ یہاں ٹھہریے جی! میں بالیاں بیچ کر پیسے لاتی ہوں۔''

دونوں ڈاکٹر کے کیبن سے باہر آئے۔

''تم اکیلے ہی جاؤ گی شانو!'' (اُس کی بیوی کا نام شانتی تھا لاڈ سے وہ اُسے شانو کہتا تھا) ''میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں!'' وہ PICU کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''آپ وہاں ہی کھڑے رہنا۔ دروازے میں سے اپنے بیٹے کو دیکھتے رہنا میں سنار کی دکان سے بالیاں بیچ کر آتی ہوں۔''

شانو اسپتال کی سیڑھیاں اُتر کر چلی گئی اور وہ PICU کے دروازے کے پاس کھڑا گول شفاف کانچ سے اندر جھانکنے لگا۔

اندر اُس کا بیٹا سفید چادر کے چھوٹے سے بستر پر پڑا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا.... بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا جائے۔ اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹا کر اُس کا خوب پیار کرے۔ مگر اُسے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ دل مسوس کر دیر تک اندر جھانکتا رہا۔ پھر اُس نے دروازے کے اوپر دیوار میں لگی گھڑی دیکھی۔ بارہ بج رہے تھے۔ اُس کی بیوی کو اسپتال سے گئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

''کافی دیر ہوگئی۔ شانو ابھی تک کیوں نہیں آئی؟''

بے قرار ہو کر وہ سوچنے لگا۔ سنار کی دکان اسپتال سے دور ہے۔ سڑکوں پر آج کل رش بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ کسی سگنل Signal پر پھنس گئی ہوگی—، مگر دو گھنٹے بہت ہوتے ہیں—، اُس سنار کی دکان تو بند نہیں ہے، جہاں سے اُس نے بالیاں خریدی تھیں!'' خدشات اُس کے ذہن میں سر اُٹھا رہے تھے اور وہ عالم بے قراری میں اسپتال کے گیٹ میں چلا آیا تھا۔

گیٹ میں آئے ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُسے شانو آٹو رکشہ سے اتری دکھائی دی۔ وہ فوراً اسپتال کی سیڑھیاں اُتر کر اُس کی طرف بڑھا۔

''ارے آپ یہاں کیوں آ گئے جی! وہیں PICU کے دروازے پر کھڑے رہنا تھا نا!'' شانو اُسے اپنی طرف آتا دیکھ کر بولی۔

جواب میں اُس نے کچھ نہیں کہا۔

وہ دونوں اسپتال کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چڑھتے چڑھتے شانو نے اپنے بلاؤز کے گلے میں ٹھونسے ہوئے نوٹ نکالے اور اُس کی طرف بڑھا دیے۔ ''لو یہ ساڑھے آٹھ ہزار روپے ہیں، دے مارو ڈاکٹر کے منہ پر اڑتیس ہزار روپے اور لے چلو اپنے بیٹے کو!''

اُس نے شانو کے دیے ہوئے نوٹ گنے۔ جیب میں رکھا اور پھر نرس سے اجازت لے کر دونوں ڈاکٹر کے کیبن میں گئے۔

ڈاکٹر اپنے بیش قیمت اسمارٹ فون پر گیم کھیل رہا تھا.... ''ڈاکٹر صاحب!''

ڈاکٹر نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ''لائے اڑتیس ہزار روپے؟'' ''ہاں—!''

ڈاکٹر نے ٹیبل پر رکھی بیل دبائی— نرس اندر آئی۔

ڈاکٹر نے نرس کو PICU سے بچے کو ڈس چارج کرنے کی ہدایت دی اور اُسے نسخہ لکھ کر آٹھ روز بعد بچے کو چیک اپ کے لیے لانے کا کہہ کر کاؤنٹر پر اڑتیس ہزار روپے جمع کرنے کا آرڈر دیا۔ دونوں سر جھکائے ڈاکٹر کے کیبن سے نکلے۔

''پہلے پیسے جمع کرا دو!'' نرس نے حکم دیا۔

اُس کا جی چاہا کہ نرس کا منہ نوچ لے مگر وہ بے بس تھا۔ دانت پیس کر خموش کاؤنٹر پر چلا گیا۔ اڑتیس ہزار روپے جمع کرائے۔

شانو بیٹے کو PICU سے لے آئی تھی۔ پھر دونوں اسپتال سے نکل کر گھر جانے کے لیے آٹو رکشے میں سوار ہو گئے— آٹو رکشہ چل پڑا۔

اُس نے شانو کی گود سے بچے کو لیا۔ اُس کا پیار کیا اور پھر شانو سے پوچھا۔ ''شانو! بالیاں تو اپن نے نو ہزار میں بنائی تھیں نا؟'' ''ہاں، سنار نے دو ہزار روپے بٹّا کاٹا تھا۔ میں نے بہت منت سماجت کی اپنی پریشانی بتائی تو اُس نے ایک ہزار روپے کم کیا اور میری پریشانی سن کر پانچ سو روپے زیادہ دیے!''

''بڑا دیالو ہے سنار—! دنیا ایسے لوگوں سے ہی قائم ہے!''

شانو جواب میں کچھ نہ بولی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اندر پھانس کے کھٹکنے سے اُس کا بدن درد سے بھر گیا تھا۔ پلکوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے.... وہ یہ سچ کہہ نہ سکی تھی کہ سنار دیالو نہیں، اُس نے پندرہ سو روپے زیادہ دے کر میرے جسم کو بٹّا لگا دیا ہے۔ میں نے اپنا جسم اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ ''یہ کہنے کی اُس میں شکتی نہیں تھی کیوں کہ وہ درد سہنے والی عورت تھی۔

شوہر اُس کی پیٹھ سہلا رہا تھا.....

''رومت شانو! دیکھ، اس ظالم دنیا میں آ کر اپنا بچہ کیسا ہنس رہا ہے!''

○○

○○